ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.5,Issue No.2(2023)
(July to September)

یونس جاوید کے ناولوں کا سماجیاتی جائزہ

Socialatic Analysis of Younis Javed's Novels

محمد ادریس
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس، سب کیمپس، ملتان
ندا منیر
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس، سب کیمپس، ملتان
ڈاکٹر محمد شکیل پتافی
پروفیسر، شعبہ اُردو، نیشنل کالج آف بزنس ایڈمنسٹریشن اینڈ اکنامکس، سب کیمپس، ملتان

Muhammad Idrees
Ph. D Scholar, Department of Urdu, NCBA& E Sub Campus, Multan
Nida Munir
Ph. D Scholar, Department of Urdu, NCBA& E Sub Campus, Multan
Dr. Muhammad Shakeel Pitafi
Professor, Department of Urdu, NCBA& E Sub Campus, Multan

Abstract:
Younis Javeed is a famous Pakistani fiction writer. He also earned name as madoon, sketching personality traits and as editor of books and magzines. He joined idara Majlis Tarraqi Adab Lahore in 1964 and retired in 2004. He started story writing in1958 and still he is writing stories in 1970's PTV started telecasting daramas. Younis Javeed as TV darama writer showed his creative abilities by pointing out social issues. Ragan main andhera, kanch ka pul and andhera ujala are his representative plays and duty is duty, zawal, Dosri Kahani, Nijat, Awazin, Aik Basti Ki Kahani are his representative short stories. He also showed his social consciousness. Akhir-e-Shub, Kanjri Ka Pull, and Stwant Singh Ka Kala Din, are such a social novel that represent are culture, civilization, social problems, injustice in society, terrorism, Pak and India present day problems. These novels prove that Younis Javeed is a progressive writer who realy has writen his fiction for the society.
Keywords: Younis Javed, Socialatic,Akhir-e-Shab, Tribal Customs, Kanjri Ka Pull, Social, Injustice, Stawant Sing,Subcontinent

یونس جاوید عصر حاضر کے ایک نام ور افسانہ نگار، ڈراما نگار، خاکہ نگار، محقق و مدون اور ناول نگار ہیں۔اُنھوں نے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں دیکھنے کا آغاز کیا اور اُردو اور پنجابی ادب میں گراں قدر خدمات سر انجام دیں۔ جس دور میں یونس جاوید نے لکھنا شروع کیا ،اس دور میں پاکستانی ادب تخریت کاری کا شکار تھا۔ ترقی پسند تحریک ٹھوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ جدیدیت کی تحریک اردو میں نیا نیا جنم لے رہی تھی ۔ البتہ حلقہ ارباب ذوق کے زیر سایہ پاکستانی ادیب اور دانش ور اس تخریب کاری سے بچ کر اپنی ایک سمت کا تعین

کرنے میں مصروف تھے۔ یونس جاوید نے حلقہ ارباب ذوق میں باقاعدہ طور پر 67-1966ء میں داخل ہو کر خود کو ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کے بکھیڑوں سے بچا کر اپنی ساری توجہ تخلیق ادب پر مرکوز کر دی۔ مجلس ترقی ادب کے پلیٹ فارم سے "صحیفہ" کی ادارت کی ذمہ داریاں بخوبی انجام دینے کے ساتھ وہ متواتر لکھتے رہے۔ اُنھوں نے پی ٹی وی کے لیے ڈرامے لکھنے کا آغاز 1972ء میں کیا۔ کانچ کا پل، رگوں میں اندھیرا اور اندھیرا اجالا جیسے ڈرامے شاید کبھی بھی فراموش نہ کیے جا سکیں۔ یہ وہ ڈرامے تھے جو نا صرف پاکستان بل کہ پاکستان سے باہر بھی بہت مقبول ہوئے۔ یونس جاوید کے ڈراموں کی تعداد ساڑھے چار سو سے زاید ہے۔ یونس جاوید کے سماجی شعور کی جو جھلک ان کے ڈراموں میں واضح نظر آتی ہے، وہی جو خوبیاں ان کے افسانوں اور ناولوں میں بھی موجود ہیں۔ ان کے چار افسانوی مجموعے "تیز ہوا کا شور"، "آوازیں"، "میں ایک زندہ عورت ہوں" اور "ربا سچیا رب قدیر" شایع ہوئے۔ بعد ازاں اُنھوں نے چاروں افسانوی مجموعوں کو "پل صرط کے بعد" میں یکجا کر کے شایع کروایا۔ ان کے افسانوں میں نہ صرف یہ کہ ان کے سماجی شعور کی جھلک نظر آتی ہے بل کہ فنی لحاظ سے بھی اُنھوں نے تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ خاکہ نگاری، تحقیق و تدوین، ایک شعری مجموعہ "حلقہ ارباب ذوق" پر تحقیقی مقالہ، شیخ امام بخش ناسخ کی کلیات کی تدوین، "صحیفہ اقبال" اور اقبالیات کی مختلف جہتیں، ناولٹ "دل کا دروازہ کھلا ہے"، آپ بیتی ایک آنسو، تین فلمیں "بے نظیر"، جوڑا، "ڈائریکٹ حوالدار" کے علاوہ تین شہکار ناول "آخر شب"، "کنجری کا پل" وار "ستونت سنگھ کا کالا"، "دن وہ بے مثال" تخلیقی کارنامے ہیں جن کی اپنی تخلیقی انفرادیت ہے۔ فنی و فکری وسعت نظر کا جو مظاہرہ یونس جاوید نے سر انجام دیا ہے، اس کی بدولت انھیں پاکستان اور بھارت کے علاوہ دنیا بھر میں بھی خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ "نیشنل فلم ایوارڈ" پی ٹی وی سلور جوبلی ایوارڈ، ایشین بین الاقوامی ایوارڈ سمیت ملک کے ایک کئی اہم اعزازات اور ایوارڈ ز ان کی خدمات کا کھلا اعتراف ہیں۔ البتہ یونس جاوید کے ناولوں کی فنی و فکری خوبیوں کو شاید کم توجہ دی گئی ہے، کیوں کہ ۲۰۱۱ء میں شایع ہونے والا ناول "کنجری کا پل" اور ۲۰۱۴ء میں شایع ہونے والا ناول "ستونت سنگھ کا کالا دن" سماجی حقیقت نگاری کی اہمیت کے حامل ایسے ناول ہیں جنھوں نے یونس جاوید کو صف اول کے ناول نگاروں کی صف میں شمار کرنے کے اہل بنا دیا ہے۔ یونس جاوید کی ناول نگاری ان سبھی خوبیوں سے مزین ہے جو ایک ناول نگار کی بھرپور پذیرائی کا تقاضہ کرتی ہیں۔ ان ناولوں میں کئی ایک فنی و فکری خوبیاں ہیں جو انفرادی ہیں؛ لیکن سب سے بڑھ کر اہم ان ناولوں کی سماجیات ہے۔

ہمارا معاشرہ سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی سطح پر جن مسائل اور حالات سے دوچار ہے۔ معاشرتی بگاڑ، مابعد نو آدیاتی مصائب، موجودہ سیاسی انتشار کا منظر نامہ اور پاکستان میں دہشت گردی اور استعماریت کی عالمی لہر کے اثرات، تقسیمِ ہند کی ناانصافیوں، انگریزوں کی تقسیم کے بعد پاکستان اور بھارت کو مستقبل طویل سیاسی اور سماجی مسائل سے دوچار رکھنے کی حکمت عملی، پاکستان اور بھارت کے دور میان تنازعات کی موجودہ صورت حال اور مستقبل قریب میں دونوں ملکوں کے باہمی ٹکراؤ کے خطرات سے لے کر مستقبل اور حال کی پاکستانی اندرونی خلفشار اور صوبائیت جیسے مسائل کو جزئیات نگاری کے فن کی خوبیوں کی مدد سے یونس جاوید نے نہایت مدلل انداز میں موضوع بحث بنایا ہے۔

ادب معاشرے کا ترجمان اور تشریح کار ہے جب کہ ایک ادیب اپنی سوچ، افکار اور خواہشات کو تخیلی صلاحیتوں کے بل بوتے پر بہترین الفاظ اور اسلوب کا استعمال کرتے ہوئے سماجی دائرہ میں رہتے ہوئے تخلیق کاری کرتا ہے۔ ادب کا بنیادی فریضہ زندگی کے مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے زندگی کی نمایندگی کرنا ہے۔ تخلیق کار کو سماجی اکائی ہونے کے ناطے سماج کے افراد کی ادبی تشکیل دینا

ہوتی ہے۔ ایک تخلیق کار یا ادیب کی تحریر میں معاشرتی مسائل، سماجی برائیوں اور اخلاقی قدروں کا بیان اور اَدبی و سماجی تاریخ کو احاطہ تحریر میں لانا معمول کی بات ہوتی ہے۔ ادب اور سماج کے باہمی رشتے کو سمجھنے لیے دو گروہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۔ ادب کو سمجھنے کے لیے سماجیاتی نقطہ نظر استعمال کرنے والے لوگ جو ادب کی سطح کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں اور ادب کی سماجیات سامنے لاتے ہیں۔

۲۔ سماج کو سمجھنے کے لیے ادب کا مطالعہ کرنے والے لوگ۔ مینجر پانڈے کے الفاظ میں:

> "بظاہر ادب اور سماج کا رشتہ جتنا آسان دکھتا ہے، اتنا آسان ہوتا نہیں۔ سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد ہی ادب اور سماج کی گہری وابستگی سامنے آتی ہے۔ ادب کی سماجیات کے تحت سماج سے ادب کے رشتے کا تجزیہ کرنے والے دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو سماج کو سمجھنے کے لیے ادب کا استعمال کرتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو ادب کو سمجھنے کے لیے سماجیاتی نقطہ نظر اپناتے ہیں۔ خالص رکھنے والوں کے نزدیک اچھی، بری، سطحی اور سنجیدگی والی ادبی تخلیقات میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ بڑے ادب کو یکساں اہمیت دیتے ہیں۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس کے تحت ناقدین کے ذریعہ نظر انداز لیکن مقبول عام ادب کی سماجیات سامنے آئی۔"(۱)

سماج سے ادب کے رشتے کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ ادیب یا تخلیق کار کو سماج کار کے مساوی سمجھا جائے۔ ادبی تخلیق میں یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں:

۱۔ ادب سماجی کی خارجی حالت کا مضمون ہے۔
۲۔ ادب سماج کی داخلی حالت بیان کرتا ہے۔
۳۔ ادب کسی سماج پر لسانی اثرات کا جائزہ لیتا ہے۔

ایک ادبی تخلیق کے موضوع کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے جس کی مدد سے مخصوص سماجی خدوخال اور فکری معاملات تک رسائی حاسل ہوتی ہے۔ افادی ادب ایسا ادب ہے جو ہماری سماجی زندگی کے مسائل اور معاملات کو زیر بحث لانے کا سبب بنتا ہے۔ دراصل کسی سماج میں زندگی کی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے بنیادی سماجی اقدار کو سمجھنا اور موضوع بحث بنانا ضروری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سیاسی مسائل، طبقاتی کش مکش، معاشی معاملات، سماجی روایات، رواج اور مذہبی صورتِ حال وغیرہ۔ ایک ادیب کا تخلیق کردہ ادب اس کے اردگرد کے حالات کے اکثر ادبا و شعرا نے اپنے عہد کی سماجی صورتِ حال کو موضوع بنایا ہے۔ ادب کی بیادیں حقیقی سماجی شعور پر قایم ہوا کرتی ہیں جس سے مستقبل میں سماج اور ادب دونوں تحریک حاصل کرتے ہیں۔ ادب حیات اور انسانی اور اس کے تہذیبی ڈھانچے کو متاثر کر کے سماج کی تعمیر و تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ اس سلسے میں ڈاکٹر محمد حسین کا نقطہ نظر ملاحظہ فرمایے:

> "ادب کا اعلیٰ ترین حصہ زندگی کو براہِ راست نہیں بدلتا۔ وہ نعروں میں باتیں کرنے، مسائل کا فوری حل دینے سے زیادہ نسبتاً دیر پا عناصر سے بحث کرتا ہے۔ ادبی تاریخ میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ وقتی بحران اور قومی المیہ کے لمحوں میں فوری حل دینے والی نگارشات ادب کے درجہ پر ممتکن

ہوئی ہیں؛ لیکن ایسی نگارشات اصول حیثیت نہیں رکھتی ہیں اور اصولوں کی مستثنیات میں سے ہیں۔"(۲)

ایک تخلیق کار سماجی زندگی کے عروج وزوال اور اور اقدار کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ادیب کو اپنے طبقے اور دور کی حقیقی نمایندگی کرنی چاہیے۔ایک ادیب کی سوچ آفاقی ہوتی ہے۔اس کی سوچ کو ایک عہد اور ایک طبقے تک محدود کر دینا ادب اور سماج دونوں سے سراسر زیادہ ہوگی۔

ایک ادیب کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ خود کو محدود ہونے سے بچائے اور سماجی اور طبقاتی خیالات کو عالمی تناظر میں دیکھے تاکہ ادب اور سماج کا باہمی تعلق عالم گیریت سے ہم کنار ہو۔ادب میں سماجی زندگی کے سب دھارے سمٹ جاتے ہیں لہٰذا ادب معاشرے کی اجتماعی صورتوں کو پیش کرنے کا وسیلہ اور انسانی ذہنی ارتقا کی دستاویزی تصویر ہے۔یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ادب میں عالم گیریت کا مفہوم پھیل کر آفاقیت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔افلاطون اور ارسطو نے ادب کو اخلاق اور کردار کی تعمیر کا وسیلہ قرار دیا تھا۔ جب کہ بعد کے ادبا بھی اس سے افادی قرار دیتے ہیں۔ادب کا اظہار حسن بن جانا بھی اپنی جگہ معنی رکھتا ہے مگر انسان کے مادی مسائل کو حل کرنے میں اس کے کردار کا شامل ہونا بہت ضروری ہے۔علی عباس حسینی نے لکھا ہے:

> "ادب کے مقاصد کے دو نظریات میں پہلا نظریہ رسکن جب کہ دوسرا وائلڈ کا تھا۔رسکن کے مطابق ادب کا مقصد اعلیٰ اصلاح کردار و فروغ روحانیت ہے۔اگر ادب ہماری سیرت و اخلاق کو بہتر نہ بنائے اور قاری کو اس سے بہرہ ور نہ کرے تو ادب اپنی منزل تک نہ پہنچا اور دم توڑ گیا۔ وائلڈ ادبی تخلیقات کو اخلاقیات کی بجائے ادب برائے ادب کے اصولوں پر پرکھنے کا خواہاں تھا۔ (۳)"

سماجی شعور تہذیب وثقافت اور تاریخ کے نظریات پر مشتمل ہوتا ہے۔تہذیب سے مراد کسی ملک یا قوم کی داخلی اور خارجی زندگی کی امتیازی خصوصیات ہیں جو اس ملک یا قوم کے فنون لطیفہ، ادب، عقاید، رسم ورواج، فلسفیانہ خیالات اور بودوباش کی صورت یں ہمارے سامنے آتا ہے۔ہر قوم اپنی خاص امتیازی خصویات کی حامل ہونے کی وجہ سے الگ شناخت اور پہچان رکھتی ہے۔دنیا کی ہر قوم اپنی اقدار، روایات اور تہذیب کی بنانے، سنوارنے اور محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔کوئی بھی تہذیب اپنی قوم اور اس کے سماج کے شعور کا مجموعہ ہوتی ہے۔یہ اس کے کل، آج اور مستقبل کی پیش گوئی کرتی ہے۔

ایک ادیب اپنے سماج کے مصلح کا کردار ادا کرتے ہوئے اپنے ادب میں بیانیہ سماج کے ناپسندیدہ کرداروں مثلاً ظلم وجبر، افراتفری، انتشار اور نفرت جیسے عوامل کو سامنے لاتا ہے۔انھیں معاشرے کے سامنے پیش کرتے ہوئے، ان کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور سماج کے لیے ناقابل برداشت قرار دیتے ہوئے، نفرت اور ملامت پر اکساتا ہے بل کہ انھیں معاشرے کے لیے ناقابل برداشت قرار دیتا ہے؛ لیکن اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ وہ سماج کے غیر تغیر پذیر اور مفید اقدار کی ترویج نہیں کرے گا بل کہ ادب اپنے فن کے لیے سارا خام مال ہی سماجی اور تہذیبی زندگی کے پس منظر سے حاصل کرتا ہے۔وہ اپنے ماحول اور سماج سے تحریک لیتا ہے۔سماجی رویوں کو سمجھ کر خیالات واحساسات اور نظام فکر سے ادب تخلیق کرتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی مسائل کی نشان دہی فنی اور اُسلوبی چابک دستی سے کرتا ہے۔ایسا تبھی ممکن ہے کہ سماج کو لے کر اس کے شعور میں پختگی اور بالیدگی ہو۔ادیب کے لیے عصری آگہی نہایت ضروری ہے تاکہ فن اور ادب اپنی وسعت اور جامعیت کی بدولت قوم کے مستقبل کا تعین کر سکے۔ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

"صحت مند ادب کی پہچان یہ ہے کہ اس کی فکری اور شعوری روح تندرست ہو اور اس کی تندرستی کی علامت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کی پاکیزگی اور طہارت اور اس کی تقویت و وسعت میں ممد ہو۔ ادب کا بہت بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ زندگی کی ترقی اور تازگی میں اعتقاد رکھتا ہے یا نہیں ۔ اگر کوئی ادب زندگی اور اس کی ترقی میں یقین نہیں رکھتا تو وہ گویا ایسی اقدار کا حامل ہے جن کا زندگی سے کچھ تعلق نہیں۔"(۴)

اُردو فکشن کا ابتدائی دور داستانوی ادب پر مبنی تھا۔ اس دور کے سادہ لوح لوگوں کو قصوں اور کہانیوں نے اپنی طرف مائل رکھا۔ اس دور کا انسان اپنی عملی زندگی کی الجھنوں اور تلخ حقایق کو نظر انداز کرنے پر مجبور تھا۔ بیسویں صدی کی پہلی تہائی تک اردو ادب میں داستان کی جگہ کہانی، افسانہ اور ناول لے چکا تھا مگر اردو ناول اس دل کشی اور اسلوب سے مزین نہ تھا جو کہ اس صنف ادب کا خاصہ ہے ۔ حجاب امتیاز علی نے داستانوں کی جگہ اپنے ناولوں میں سماجی حقایق کو پرویا۔ نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم نے اپنی سماجی حقایق کی پیش کش کے ذریعے قارئین کی داد وصول کی۔ دھن پت رائے نے پریم چند کا لبادہ اوڑھا اور اس طرح اردو فکشن نے ایک نئی راہ چن کر سماجی جبر اور تکالیف کی پیش کش کی ریت ڈالی۔ اردو کے ابتدائی دور کے ان ناول نگاروں نے جس راہ کا تعین کیا بعد میں آنے والے ناول نگاروں نے اسے مزید ترقی دی اور اس طرح اُردو ناول اپنے معاشرتی و سماجی حقایق کا نمایندہ بن کر ترقی کرتا چلا گیا اور یونس جاوید تک ان گنت ناول نگاروں نے اپنے تئیں سماجی نمایندگی کا فریضہ انجام دینے کی ذمہ داری ادا کی۔ یونس جاوید کے ناولوں کے مطالعہ سے ان کی سماجی حقیقت پسندی، وسعت نظری اور بطور ایک تخلیق کار سماجی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ اُنھوں نے یہ ناول اس احساس میں گوندھ کر تخلیق کیے ہیں کہ ناول نگار دیگر اصناف ادب سے الگ ایک انتہائی اہم صنف ادب ہے جس کی اپنی ذمہ داریاں اور فرایض ہیں۔ اس بات کی تائید ان کے اپنے اس بیان سے بھی ہوتی ہے:

"تیز رفتاری کے دور میں ناول لکھنا اور معیاری ناول لکھنا، بہت مشکل کام ہے۔"(۵)

چناں چہ یونس جاوید نے اپنا پہلا ناول "آخر شب" ۱۹۶۲ء میں لکھنے کے بعد اپنے تخلیقی سفر کے آخری دور تک یعنی کوئی انچاس برس تک کوئی ناول نہیں لکھا؛ لیکن جب دوسرا ناول "کجری کا پل" لکھا تو احساس ہوا کہ یقیناً یونس جاوید نے اس ناول کے لیے مواد اور حوصلہ جمع کرنے میں ایک طویل زندگی صرف کر دی ہے اور جب ۲۰۱۴ء میں "ستونت سنگھ کا کالا دن" شایع ہوا تو احساس ہوا۔ ان کے پاس ناول نگاری کے لیے نہ تو موضوعات کی کمی ہے اور نہ ہی ان کا ناول نگاری کا فن محدود ہے بل کہ وہ اپنی وسعت نظر، مطالعہ، مشاہدہ اور تخلیقی تجربہ استعمال کرتے ہوئے ایک دو نہیں کئی ایک شاہکار ناول تخلیق کر سکتے ہیں۔

یونس جاوید کا پہلا ناول "آخر شب" قبائلی اور دیہاتی زندگی کی ان حقیقتوں کا ترجمان ہے جن کی ابھی تک تہذیب نہیں ہوئی ۔ اس ناول کے کردار اپنی قوت بازو پر بھروسہ رکھنے والے افراد ہیں۔ ان کرداروں کی شجاعت اور مردانگی سے ایک ایسی زندگی کا نقشہ ابھرتا ہے جو ہمارے قدیم دور سے دیہاتوں کی زندگی کا خاصہ رہی ہے۔ دیہاتی معاشرے کے افراد روایت پسند اور اپنی اقدار سے پیار کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اسی عنصر کو نمایاں کرتے ہوئے یونس جاوید نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرے کی منفی اقدار زیادہ پائیدار نہیں ہوتی ہیں اور آخر معاشرے کے اندر سے ان منفی اقدار کے خلاف نفرت اور بغاوت کا جذبہ اُبھرتا ہے جو زور بازو قوت و عزم سے اپنی فرسودہ روایات کو مسترد کرتا ہے اور معاشرتی انقلاب برپا کرتا ہے۔

اس ناول کا پلاٹ دو قریبی ہمسایہ گاؤں جمنا پور اور ناظم کوٹ کی سماجی زندگی کے گرد گھومتا ہے۔ ان دونوں گاؤں کے لوگ پشتو بولتے ہیں اور پہاڑی پنجابی بھی بولی جاتی ہے۔ صدیوں سے اس گاؤں کے لوگوں کا رواج چلا آرہا ہے کہ وہ لڑکی پیدا ہوتے ہی شادیانے بجاتے ہیں اس کو پال پوس کر بڑا کرتے ہیں اور جیسے ہی وہ جوان ہوتی ہے۔ اس کو پیسوں کے عوض بیچ دیتے ہیں۔ پہلے پہل گاؤں کے بڑے اس اصول پر کاربند تھے کہ وہ لڑکی کو اپنی برادری اور گاؤں کے کسی مرد کو بیچ دیتے تھے جو شادی کر لیتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ پیسوں کے لالچ میں اب اس اصول کو فراموش کر دیا گیا اور جو زیادہ پیسے دے وہ لڑکی خرید کر لے جاتا ہے، چاہے اس کا تعلق شہر یا کسی دور کے گاؤں سے ہی کیوں نہ ہو۔ اب گاؤں کی صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ غربت پھیل چکی تھی۔ بہت سے نوجوان بغیر شادی کیے زندگی گزار دیتے تھے کیوں کہ وہ لڑکی کے والد کی ڈیمانڈ کے مطابق رقم جمع نہیں کر سکتے۔ خود غرضی اور لالچ کی صورتِ حال یہ ہے کہ زیادہ پیسوں کے لالچ میں بوڑھے افراد کو بھی لڑکیاں بیچ دی جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں ہمیشہ کے لیے اپنے والدین، رشتہ داروں اور بہن بھائیوں سے بچھڑ جاتی ہیں؛ لیکن صدیوں سے گاؤں کے اندر ہمدردی کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کبھی کبھار کوئی لڑکی بغاوت کرتے ہوئے کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ جائے یا کوئی لڑکا کسی لڑکے سے اس کے والدین کی مرضی کے بغیر شادی کر لے تو سارے گاؤں والے مل کر اسے سزا دیتے ہیں۔ زبیر علی خان صرف زبیری ایک سردار کا بیٹا تھا۔ بچپن میں ہی والدین کی موت کا صدمہ برداشت کرنا چناں چہ وہ غربت کی وجہ سے شادی نہ کر سکا۔ گاؤں والوں نے اسے سردار بنالیا؛ لیکن وہ سرداری چھوڑ کر گاؤں سے نکل کر دوسرے گاؤں کی طرف چلا گیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اس گاؤں میں لڑکیوں کو بیچنے کی بجائے باقاعدہ رشتہ کر کے رخصت کیا جاتا ہے؛ لیکن اس کی یہ خوش فہمی اس وقت ختم ہو گئی جب جنگلوں میں بکریاں چرانے والی ایک خوب صورت نوجوان لڑکی سے اس کی آنکھ لڑکی اور پیار ہو گیا۔

راجی نے اسے بتایا کہ اس کی ماں بستر مرگ پر ہے۔ اگر زبیری کہیں سے چاہے چوری کر کے بھی کچھ پیسے لا دیے جس سے اس کی ماں کا علاج ہو سکے تو وہ چھپ کر زبیری کے ساتھ بھاگ کھڑی ہونے کو تیار ہے۔ زبیری ایک حویلی میں چوری کی نیت سے داخل ہوا لیکن دھر لیا گیا۔ پولیس کے حوالے سے کیا گیا۔ چھے ماہ سزا کاٹ کر وہ واپس لوٹا تو اسے راجی نے بتایا کہ اس کی ماں اگلی رات ہی فوت ہو گئی تھی اور اس کے باپ نے اس کا سودہ پانچ سو روپے کے عوض طے کر دیا ہے۔ چناں چہ اسی رات زبیری نے راجی کو ساتھ لیا اور اپنی حویلی میں لے آیا جو پہاڑی کی اوٹ میں خفیہ جگہ پر تھی اور دو آدمی ساتھ ایک مولوی بلا کر راجی سے نکاح کر لیا۔ ایک سال بعد اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ راجی کے رشتہ داروں نے اس کا سراغ لگا کر زہر دے کر مار ڈالا لیکن بچی کو کچھ نہ کہا۔ زبیری نے اس بچی جس کا نام ثمینہ رکھا تھا سارے زمانے سے چھپا کہ پالا پوسا اور تہہ کر لیا کہ وہ اس کی شادی گاؤں کی رسمیں توڑ کر اسلامی طریقے سے کرے گا۔ گاؤں سے باہر جنگلوں میں وہ اپنی بکریاں چرایا کرتا تھا وہاں ایک دن اس کے پاس شیر گل آنکلا۔ شیر گل بھی ایک سردار کا بیٹا تھا اور اس کی بہنوں کو بھی روپیہ کے عوض بیچ دیا گیا تھا تب وہ بہت چھوٹا تھا اور وہ ہمیشہ اپنی بہنوں کو دیکھنے کے لیے ترستا رہتا تھا۔ شیر گل اس قبیح رسم کے بارے میں کہتا ہے:

> "یہ صرف ایک لڑکی کا سودا نہیں ہوتا۔ بل کہ باپ کے خون کا سودا ہوتا ہے۔ بھائی کی غیرت کا سودا ہوتا ہے۔ ماں کی محبت کا سودا ہوتا ہے۔ بھائی کی غیرت کا سودا ہوتا ہے اور ان معصوم گونگی دوشیزاؤں کے جذبات کا سودا ہوتا ہے جن میں گھٹی گھٹی سرد آہیں اور چیخیں چنگھاڑتی ہوئی

فضال ہوتی ہے۔ رکے رکے آنسو، رخساروں تک پہنچنے سے پہل جل جاتے ہیں اور دل ایک ان مٹ جلن سے ہم کنار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔"(۶)

زبیری شیر گل کی دکھ بھری داستان کی کوشش کی تھی؛ لیکن میری کوئی نہیں سنتا اور ساتھ ہی شیر گل کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے:

"ان کی پیشانی پر کوئی بے نام سی تیوری بھی نہیں اُبھرتی۔ ان کی تنی ہوئی گرنوں کو بھولے سے بھی رحم نہیں آتا اور ان کے پھولے ہوئے سینوں میں کوئی دل بھول کر بھی اپنی بیٹی کی محبت کے لیے نہیں دھڑکتا۔ ان کے چہروں سے شرم وحیا، عفت وعصمت اور غیرت کے جذبات کی غمازی کرنے والی گردنیں ہمیشہ کے لیے کوچ کر جاتی ہیں۔"(۷)

زبیری اور شیر گل کے خیالات ملتے جلتے ہیں۔ دونوں اپنے سماج کی اس فرسودہ اور شرم ناک رسم کو ختم کرنا چاہتے ہیں؛ لیکن بے بس ہیں۔ دونوں کی طبیعت کے میلان کی وجہ سے دونوں میں دوستیاں ہو گئی۔ زبیری نے شیر گل کو بھتیجا بنالیا۔ وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ کچھ ہفتوں بعد اس نے اپنی بیٹی ثمینہ کی شادی بغیر قیمت وصول کیے شیر گل سے کر دی اور گاؤں کی اس قبیح رسم کو توڑ ڈالا۔ چند ہفتوں بعد شیر گل ثمینہ اور زبیری، شیر گل کے گاؤں روانہ ہو گئے۔ شیر گل اور ثمینہ کے ہاں دلاور گل، فواہر گل کی پیدایش ہوئی۔ ثمینہ پھر پیٹ سے تھی؛ لیکن سخت تکلیف میں۔ آخر کار شیر گل، ثمینہ کو شہر کے سرکاری ہسپتال میں لے گیا۔ جہاں آپریشن سے ثمینہ کے ہاں بیٹی کی پیدایش ہوئی جس کا نام ریشماں رکھا گیا؛ لیکن زچگی کے دوران ثمینہ کی موت ہو گئی اور شیر گل پاگل ہو گیا۔ ہسپتال میں عملہ نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا اور نتیجتاً ثمینہ کی حالت زیادہ خراب ہو گئی بروقت علاج ہوتا تو ثمینہ کی جان بچ سکتی تھی۔ ہسپتال کے عملہ کی بے حسی کی صورتِ حال کا ایک منظر ملاحظہ کیجیے:

"چند منٹ تو وہ سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا پھر اس نے خود ہی تیزی سے بیچ کا فاصلہ طے کر کے خطر ناک کیس کی گھنٹی میں لگی ہوئی زنجیر کھینچ دی۔۔۔ مجھے سخت افسوس ہے میں آج ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔ تم مس جعفری سے مل لو، کون مس جعفری کہاں ہے؟۔۔۔ معاً اسے نرس کے قہقہے کے ساتھ مردانہ گھمبیری آواز نے چونکا دیا۔"(۸)

یونس جاوید نے اس ناول میں سماجی زندگی کی تلخ حقایق بیان کیے ہیں۔ طلب کے شعبے سے وابستہ افراد کو انسان نہیں فرشتے گردانا جاتا ہے اور ایک خاتون کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مردوں کے مقابلے سے زیادہ نرم دل اور خدمت کا جذبہ رکھتی ہیں؛ لیکن ناول میں پیش کیا گیا یہ واقعہ بھی ایک حقیقت ہے۔ ہمارے ہسپتالوں میں مصیبت زدہ مریضوں کو بعض مرتبہ اس سے بھی زیادہ تلخ رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب شیر گل کو بیوی کی موت کا صدمہ پہنچا وہ بے ہوش ہو گیا اور ذہنی توازن کھو بیٹھا اور ایک لمبے عرصہ کے لیے لاپتہ ہو گیا۔ زبیری ایک ماہ کے طویل انتظار کے بعد آخر کار ہسپتال آپہنچا اور ایک نرس اس کی زیر کفالت پرورش پا رہی ریشماں کو ساتھ لے گیا۔ گاؤں جا کر اس نے دلاور گل، فواہر گل اور ریشماں کی بھرپور نگہداشت کی۔ اس کی دیرینہ دوست ناصر خان جس کا ایک خاندانی دشمنی میں قتل ہو گیا تھا کا بیٹا شہزاد خان بھی اسی کے پاس تھا۔ اس نے سب بچوں کی خوب دیکھ بھال کی۔ بچے جوان ہو گئے اور زبیری بوڑھا ہو چکا تھا۔ تینوں لڑکے جوان تھے۔ دلاور بھی ایک سردار کا بیٹا تھا اور شہزاد خان بھی۔ شہزاد، دلاور کی بہن ریشماں سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔ دلاور اور فواہر نے گھڑ سواری اور نیزہ بازی میں ہارت حاصل کر لی تھی؛ لیکن شہزاد ایک فطری

مصور تھا جسے گھڑ سواری اور نیزہ بازی سے دل چسپی نہ تھی۔ دلاور جانتا تھا کہ شہزاد گاؤں کا سردار بننے والا ہے۔ وہ خود سردار بننا چاہتا تھا چناں چہ اس نے دلیر خان سے ساز باز کر کے شہزاد خان کو ایک سال کے لیے اس شرط پر شہر بھیج دیا کہ ایک سال بعد اس کی شادی ریشماں سے کر دی جائے گی اور سالانہ میلے میں شہزاد کی گیر موجودگی میں اسے سردار چن لیا گیا۔ دلاور نے پیسیوں کی ہوس میں ریشماں کو دلیر خان کے ہاتھ بیچ دیا۔ فواہر شہر جا کر شہزاد خان کو ڈھونڈ لایا؛ لیکن تب تک دلاور مکان بیچ کر اور ریشماں کو دلیر کے ہاتھوں بیچ کر غائب ہو چکا تھا۔

دلیر خان، زاہد خان، کرمو اور نعیم خان اس ناول کے ایسے کردار ہیں جو بردہ فروش ہیں۔ گاؤں کے لوگوں سے لڑکیاں خرید کر لے جاتے ہیں اور چند دن عیاشی کر کے شہر میں سے آئے ہوئے گاہکوں کو بیچ دیتے ہیں۔ شیر گل اور زبیری نے جس رسم کو ختم کیا تھا، دلاور نے اسے پھر سے زندہ کر دیا۔ جب فواہر اس کو اس کے شہزاد سے کیے گئے وعدے کی یاد دلاتا ہے تو دلاور یوں جواب دیتا ہے:

> "وہ ایک وقتی جذبہ تھا اور میری سب سے بڑی کم زوری ورنہ تمام عمر ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والا۔ ہماری برابری۔۔۔ ریشماں کو بیاہ دینے سے ہم سب شہر چلے جائیں گے۔ بنگلہ ملے گا۔ کاروبار ہو گا۔ دولت ہو گی اور ہر چیز میسر ہو گی۔ شہزاد ہمیں کیا دے سکتا ہے؟"(۹)

یونس جاوید نے اس المیہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ قبائلی معاشرے میں اس رسم کے خاتمے کی کوشش کی تو کی جاتی ہے؛ لیکن یہ رسم پھر سے زندہ ہو جاتی ہے۔ ایک قبائلی لڑکی بشریٰ جو اس عمل سے گزر کر فرار ہو گئی ہے۔ بی بی سی کے نمایندے سے گفت گو کرتے ہوئے بتایا کہ:

> "میرا رشتہ بیس ہزار روپے میں طے پایا تھا اور یہ رقم غریب والدین کو دی گئی۔ یہ لڑکی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شادی ہو گھر اور خاندان ہو اور وہ عزت کے ساتھ زندگی گزارے؛ لیکن یہاں تو میرا سودا کیا گیا تھا۔"(۱۰)

جو لوگ خرید کر ایک لڑکی سے شادی رچاتے ہیں۔ دل بھرنے کے بعد پھر سے آگے بیچ دیتے ہیں۔ یونس جاوید سماجی و معاشرتی ناول نگار ہیں۔ ان کا دائرہ کار طبقاتی نظام اور سبھی طبقات کا احاطہ کرتا ہے۔ آخر شب ایک دیہی ناول ہے؛ لیکن اس میں شہری زندگی کے خدوخال بھی سامنے آتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد سماجی المیہ دوسرے ترقی پسندوں کی طرح یونس جاوید کا بھی موضوع رہا ہے۔ ان کے نسائی کرداروں میں پامال ہونے والی عورت کی زندگی کی رمق تو رکھتی ہے؛ لیکن سماج کے سامنے بے بس ہے۔ ریشماں بالآخر موت کا شکار ہو جاتی ہے جیسے اس کی ماں موت کا شکار ہوئی تھی۔ شہزاد ایک ٹانگ سے معذور ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں ظلم و جبر اور لالچ انسانی خون میں رچ بس گیا ہو۔ اپنے حقوق کے حصول کے لیے مزاحمت کرنے والی آوازیں اکثر و بیش تر ایسے ہی سلوک کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جسے یونس جاوید نے بڑے خوب صورت بیانیے کے رنگ میں سمو کر بیان کیا ہے۔

یونس جاوید کا دوسرا ناول "کنجری کا پل" ۲۰۱۱ء میں شایع ہوا۔ اس ناول میں یونس جاوید نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ من حیث القوم ہم شدید معاشرتی بگاڑ کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس ناول میں کئی ایک خوبیاں ہیں۔ جذبات نگاری، منظر نگاری، پلاٹ اور کردار سبھی اجزا بڑی فنی مہارت سے پیش کیے گئے ہیں۔ خاص طور پر اس ناول کے مکالمے بہت جان دار ہیں۔ ڈاکٹر شاہد الرحمٰن نے لکھا تھا کہ:

"کردار نگاری کا ایک اہم حصہ مکالمہ ہوتا ہے کیوں کہ یہ نہ صرف زبان سے ادا کیا جاتا ہے بل کہ باطنی خلفشار و احساسات کا اظہار یہ بھی ہوتا ہے۔ یہ ہمیں کرداروں کی زندگی میں جھانکنے کا موقعہ ہی فراہم نہیں کرتا بل کہ ان کے محرکات کا بھی پتہ دیتا ہے۔"(۱۱)

یونس جاوید کے مکالموں نے ان کے کرداورں کے احساسات، جذبات اور نفسیاتی کیفیات کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کرداروں میں ظہرہ مشتاق ایک مرکزی کردار ہے جسے بنیاد بنا کر ناول کا پلاٹ بنایا گیا ہے۔ ایک عام سے عورت جس نے نہ صرف زیادہ تعلیم حاصل کر رکھی تھی نہ ہی کوئی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کی حامل تھی۔ پھر شادی بھی ایک ایسے مرد سے ہوئی جو سال دو سال میں ایک آدھ بار گھر آتا چند دن قیام کرتا اور دبئی پلٹ جاتا۔ ظہرہ مشتاق کا سب سے بڑا مسئلہ جنسی ناآسودگی تھا، جس نے اسے تحریک دی کہ کوئی ایسا کاروبار یا کام کیا جائے جہاں سے اسے مالی فائدہ کے ساتھ جنسی تسکین کا سامان بھی ملتا رہے۔ چناں چہ نوجوان لڑکوں کو ڈانس کی ٹریننگ دینا ایک آئیڈیل کاروبار تھا۔ فیشن ڈیزائننگ اور بوتیک بھی ایسے ہی مشغلے تھے، جہاں سے اس نفسیاتی ہیجان کو دور کرنے کی کوشش کی جاسکتی تھی؛ لیکن جنسی ہوس ایک ایسی بیماری ہے جو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

چناں چہ اس کے سارے دھندے نے دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتے چلے گئے۔ زیادہ ڈیمانڈ پوری کرنے کے لیے اور ہر طبقہ کے لوگوں کے عیش کا سامان کرنے کے لیے کاریں، بنگلے، کھوٹھیاں اور نوجوان لڑکیوں کے تعداد بڑھتی ہی چلی گئی۔ ناول نگار کے الفاظ میں:

"اس نے آج تک سینکڑوں لڑکیاں، جو تیرہ سال سے بھی چند دن کم کی تھیں بڑے بڑے صاحب اختیار لوگوں پر یوں لُٹا دی تھیں جیسے باراتوں میں پھول نچھاور کر دیے جاتے ہیں۔ (۱۲)"

یونس جاوید نے ایک احساس اور حقیقت پسند ادیب ہونے کی حیثیت سے جنس نگاری کی تشہیر کرنے سے گریز کیا ہے بل کہ اُنھوں نے ایسے واقعات کو حوالہ کے طور پر علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اصل فوکس اس معاشرتی المیہ کو نمایاں کرنے پر رہا ہے کہ ہمارے سماج کا ہر طبقہ کیسے طوائف الملوکی کا شکار ہے اور کس قدر اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"ہمارے ہاں عورت کے بارے میں جسم ذات، روح، وجود اور شخصیت کے بارے میں جسم، ذات، روح، وجود اور شخصیت کے بارے میں سنجیدہ سوچ اور پھر ہمہ گیر خیالات نہ ہونے کے برابر ہیں۔۔۔ ویسے بھی عورت اور اس کے تعلقات کے ضمن میں اگرچہ ہر شخص گفتار کا غازی ثابت ہوتا ہے مگر اس کے پاس نہ تو نفسیاتی مطالعہ ہوتا ہے اور نہ ہی وہ عمرانی اور اقتصادی شعور جس کی روشنی میں وہ غیر متعصبانہ گفت گو کا اہل ثابت ہو سکے۔"(۱۳)

عموماً اُردو ناولوں میں عورت کی جنسی اور نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتے ہوئے۔ مرد ناول نگاروں نے عورت کی زندگی کو پوری طرح بیان نہیں کیا جس کی وجہ سے ڈاکٹر سلیم اختر کا بیان درست ہے؛ لیکن یونس جاوید کے اس پورے ناول میں ہمیں عورت سے تعصب اور تفریق کا کوئی عنصر دکھائی نہیں دیتا بل کہ وہ مرد سماج کے عورت کے بارے میں کم زور کردار کی نشان دہی کرتے ہیں چاہے مالی مشتاق کا کردار ہو، حضرت عطار کا کردار ہو یا دیوان عاشق حسین اور قادر جونیجو یا کاشف خان۔ یہ سبھی کردار ایسے کردار ہیں جو عورت کے جذبات کے آگے کم زور ثابت ہوتے ہیں۔ فہمیدہ جام مصدق کے پھیلائے ہوئے جال سے اپنے عاشق کو بچانے کے لیے اپنی

زندگی داؤ پر لگا دیتی ہے۔ ناول کی مرکزی کردار ظہیرہ مشتاق اپنی بیٹی کے باپ کی جانب سے اس کا رشتہ مانگنے کے واقعے کے بعد اپنے پیسے سے متنفر ہو کر توبہ کرتی ہے اور اپنی ماضی کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہے؛ لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ عورت ہر مرد کی کم زوری ہے۔ چاہے حضرت عطار جیسی روحانی شخصیت ہو، چاہے دیوان عاشق حسین، جام مصدق، جعفر علی زند ہو، کاشف حسین یا سلمان گوہر۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے پیشے اور دھندے میں بے ایمانی اور بد عنوانی کرتے ہیں اور اپنی خانگی زندگی سے راہ فرار حاصل کر کے طوائف کے کوٹھے کا رخ کرتے ہیں۔ اس ناول کے کئی ایک رخ ہیں۔ یونس جاوید نے جذبات نگاری کی مدد سے بہت سے ایسے مسائل کی طرف بھی توجہ دلائی ہے جو اکیسویں صدی میں ایک بہت بڑا درد سر ہیں۔ دہشت گردی اور معاشرتی انتشار پر سوال اٹھاتے ہیں:

> "ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ ظلم ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی ناانصافی ہے۔ گناہ عظیم ہے تو پاکستان سے لے کر پوری دنیا میں اس قدر آسانی سے کیوں ہو رہا ہے یہ گناہ عظیم۔"(۱۴)

عالمی استعماریت کے نتیجے میں دنیا بھر میں مظلوم انسانوں کی آواز بن کر سوال کرتے ہیں:

> "انسان اکیسویں صدی تک آتے آتے اپنے ذہین ترین ہونے کا ثبوت دے چکا ہے تو پھر دنیا کے شہ دماغوں نے خون بہانے کا لائسنس کیوں جاری کر رکھا ہے۔ کشمیر سے کرغستان تک یہ کیوں بہہ رہا ہے۔ بوسنیا سے فلسطین تک اور عراق سے افغانستان تک اور کراچی سے علی ہجویری کے مزار تک کتنا بہہ چکا ہے کہ آدھی دنیا ہو بہو دیکھائی دیتی ہے۔"(۱۵)

ملک کی سیاسی شخصیات کی نمایندگی کرتے کردار دیوان عاشق حسین، جام مصدق، جعفر علی رند، سلمان گوہر، مذہبی شخصیات حضرت عطار کی زندگی کے جو پہلو یونس جاوید نے اس ناول میں نمایاں کیے ہیں یہ ہمارے ملک کی موجودہ اشرافیہ کی زندگی کی حقیقی تصویر محسوس ہوتے ہیں۔ یونس جاوید کا ناول "کنجری کا پل" ہمارے معاشرے کے ان تلخ حقائق کی نفسیاتی صورتحال کا تجزیہ ہے جن تلخ حقائق سے پردہ اٹھانے کی جرات صرف یونس جاوید جیسے بے باک اور صاف گو تخلیق کار کو بندھ سکتی ہے۔ ورنہ بڑے بڑے دردِ دل رکھنے والے ادیبوں اور سماجی حقیقتوں نگاروں نے اس طرف نظر اٹھنے کے بعد خود کو لب کشائی سے بے بہرہ محسوس کیا۔ ایسے موضوعات کو زیر بحث لانے کا خیال آتے ہی ایسے تخلیق کاروں کا گلہ خشک اور اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ جاتا ہے۔ یونس جاوید نے یہ ناول لکھ کر خود کو سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی جیسے عظیم حقیقت نگاروں کی صنف میں شامل کر لیا ہے۔ حیرت انگیز طور پر عمومی رد عمل جس کا سامنا ایسی جنسی حقیقت نگاری کا مظاہرہ کر کے منٹو اور عصمت چغتائی کے حصے میں آئی تھی اس سے بھی صاف بچ نکلے ہیں۔

یونس جاوید کے اس ناول کے کسی نقاد نے ان کو وہ صلواتیں سنائیں نہ ان کے خلاف کوئی عوامی اشتعال نظر آیا جو سعادت حسن منٹو اور عصمت کو سامنا کرنا پڑا۔ اس کا میرے نزدیک مطلب یہ ہے کہ شاید یونس جاوید نے اپنی زبان کا تڑکا لگائے بغیر، لگی لپٹی باتوں کو بیان کیے بغیر صرف صرف سچائی پر مبنی تلخ حقائق کو ہو بہو جیسے انہوں نے محسوس کیے ویسے ہی پیش کر دیے یہی وجہ ہے کہ کسی نقاد نے نہ حکومت نے اور نہ ہی عوامی رد عمل نے ان کو واجب القتل، اخلاقیات کا دشمن اور نہ ہی جنسی فحش نگار قرار دیا بلکہ جس کسی نے بھی اگر چند جملوں میں بھی اپنا رد عمل دیا تو بھی اس نے یونس جاوید کی اس جرات کی ستائش کرتے ہوئے اس ناول میں پیش کردہ حقائق کی

توثیق کی۔ تائید کی اور انہیں ایسے محسوس کیا جیسے یہ حقائق یونس جاوید کا ہی نہیں اس کا اپنا مشاہدہ بھی ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نفسیاتی تنقید پر بھرپور کمانڈ اور وسعت نظر کے حامل نقاد ہونے کی حیثیت سے ایک عالمی شناخت رکھتے ہیں۔ یونس جاوید کے اس مشاہدے کی تائید میں لکھتے ہیں:

> ''کنجری کا پل اس منطقہ کی کہانی ہے جہاں تک جانے کے لیے جس پاسپورٹ کی ضرورت ہے وہ نہ میرے پاس ہے اور نہ آپ کے پاس۔ یہ منطقہ جنس ہے جہاں ماڈلز کے روپ میں کال گرلز ہیں۔ پوش علاقہ کی وہ شاندار کوٹھیاں جہاں رات کو جنس کے شکاری داد شجاعت دیتے ہوئے پتھریلی چھاتیوں اور کسے جسموں سے رس کشید کرتے ہیں۔ اور یہاں وہ مرد بھی ہیں جو مجازی خدا ہوتے ہوئے بھی بیوی کے شبستان کے دروازہ پر دم ہلاتے ہیں۔''(۱۶)

اس ناول میں یونس جاوید نے لاہور کے جس پوش علاقے کی حقیقی زندگی کی صرف ایک جھلک پیش کی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے الفاظ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہاں یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ ایک باپ اپنی بیٹی سے اور ایک بھائی اپنی بہن سے شادی رچانے کے لیے تن من دھن سب کچھ قربان کرنا کار خیر سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ظہرہ جس نے ساری زندگی اسی جنس زدہ ماحول میں پوری بے فکری سے گزاری تھی۔ اپنی بیٹی کے اچانک اپنی مرضی سے شادی کر لینے کا سن کر لرز کر رہ جاتی ہے اور سوچتی ہے۔

> ''میں اس تصور سے عمر بھر گناہوں میں ڈوبے رہنے کے باوجود لرزنے لگتی ہوں کہ دیدار حسین ولد دیوان عاشق حسین نے میری ہی کوکھ سے جنم لے کر جڑواں بہن سے شادی کر لی ہے۔ شاید میری سزاؤں میں یہ سب کڑی اور تلخ سزا ہے جو تسلسل سے مجھے مل رہی ہے۔''(۱۷)

یہی ظہرہ جب نفسیاتی شکار ہو کر روحانی سکون کی تلاش میں حضرت عطارؒ کی چوکھٹ پر سچے دل سے توبہ طاہر ہونے کا عزم لے کر باقاعدہ حاضری دینے لگتی ہے تو یہ اعلیٰ درجہ پر فائض پیر صاحب اس سے ملتمس ہوتے ہیں کہ وہ ظہرہ کو اپنے عقد میں لینا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس صورتحال پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''نیک آدمی بدکار عورت کی مدد کرتے کرتے خود اس کے جسم کا خواستگار ہو جاتا ہے۔ مجھے تو یہ عالمی وقوعہ محسوس ہوتا ہے کیوں کہ کئی اور زبانوں میں اس تھیم پر شہکار ناول اور افسانے تحریر کیے گئے ہیں کہ خراب عورت کو راہ راست پر لانے کے عمل میں مرد خود سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔''(۱۸)

ایک جسم فروش عورت کے جسم میں ایسی کشش پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کا جسم خود بخود ایک دعوت بن جاتا ہے اور اگر کسی نیک شخص کی نیکی اور زاہد و تقویٰ اس کی ذات کا جزو نہ ہو تو ایسی صورتحال میں وہ خود بخود اپنے اصلی روپ میں سامنے آجاتا ہے۔ اور جب انکار کا سامنا کرنا پڑے تو ایسے مرد واپس اپنے بہروپ میں اتر کر مذہبی ہتھیاروں کا استعمال کرتے ہوئے اپنی شیطانیت کو تسکین پہنچا کر کرتے ہیں جیسے حضرت عطار اپنے فتوؤں سے ظہرہ کی تعمیر کروائی ہوئی مسجد ڈھوا کر اور اس کی ذات پر حملہ کروا کر کرتا ہے۔ اس ناول میں یونس جاوید نے مختلف لبادوں میں چھپے شعبہ زندگی کے مختلف پہلوؤں سے وابستہ افراد یعنی مزدوروں، ملازمین، ادباء، سیاستدانوں، گدی نشینوں حتیٰ کہ دوج کے بڑے افسران تک کو جس طرح کنجری کے پل کا غلام دکھایا ہے۔ جنسی حقائق کی ایسی جھلکیاں اردو ناولوں میں ملنا آسان نہیں اس لحاظ سے یونس جاوید کا یہ ناول اردو کے اس صنف کے ناولوں میں سے ایک اہم ناول ہے۔ یونس جاوید کا ناول

''ستونت سنگھ کا کالا دن'' تقسیم ہند کے تناظر میں لکھا گیا ایک اہم ناول ہے۔ یہ ناول تقسیم ہند کے کچھ قبل کے زمانے سے لے کر زمانہ حال تک کی ہندوستان (پاک بھارت) صورتحال کی تاریخ، سیاست اور سماجی انتشار کی صورتحال پر روشنی ڈالتا ہے۔ یاد رہے کہ ستونت سنگھ وہ آدمی تھا جس نے گاندھی کا قتل کیا۔ اس لحاظ سے یہ کہانی قاری کے شعور پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے اس ناول کا مطالعہ سیاسی، سماجی، تہذیبی یا تاریخی جس پہلو سے بھی کیا جائے سوچ اور مباحثہ کے کئی نئے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اس ناول کا مطالعہ نو آبادیاتی تناظر میں ہماری نسلوں کے پرانے گہرے زخموں کی دردناک حالت کو ایسے سامنے لاتا ہے جیسے یہ زخم آج بھی نہ صرف ہرے ہوں بلکہ تسلسل سے لگائے جا رہے ہوں۔

یونس جاوید کا تیسرا ناول ''ستونت سنگھ کا کالا دن'' کا پس منظر اگرچہ سیاسی اور تقسیمِ ہند کے تباہ کن فرقہ وارانہ فسادات کی غم ناک صورتِ حال کی عکاسی کرتا ہے؛ لیکن اس افسانہ میں یہ صورتِ حال بھی ناول کی اصل کہانی میں ایک ماضی کی بازیافت ہے۔ یونس جاوید نے تقسیمِ ہند کے دور کے تلخ متشدد واقعات قاری کے ذہن پر تازہ کرتے ہوئے اس کے سامنے یہ سوال رکھا ہے کہ تب کے حالات اور اب کے حالات میں کیا فرق ہے؟ اور کیا یہ سامراجی نظام کی ترقی یافتہ شکل نہیں؟ علی سردار جعفری نے نقطہ نظر پیش کیا تھا:

> ''ادب اور تحریک کا اپنے ملک کی قومی اور انقلابی سیاست سے متاثر ہونا فطری امر ہے؛ لیکن ادب اور تحریک کو کسی سیاسی جماعت کا آلہ کار نہیں بننا چاہیے۔''(۱۹)

علی سردار جعفری کا یہ نقطہ نظر اس کے لیے اہم ہے کہ اس ناول میں یونس جاوید نے تقسیم ہند کی تحریک یا تحریک آزادی کے دوران سکھوں کے کردار پر سوالات اٹھائے ہوئے موقف ۔ اختیار کیا ہے کہ سکھوں نے تقسیم کے عمل کے دوران ہندوؤں اور کانگریس کے آلہ کار کے طور پر اہم کردار ادا کیا۔ کانگریسی لیڈروں نے جھوٹے وعدوں کے ذریعے سکھوں کی ہمدردی حاصل کی کہ وہ سکھوں کی اکثریت کے علاقوں کو ایک الگ شناخت دیں گے ۔ بعد ازاں جب سکھوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی تو کانگریس نے سکھوں پر ایسے اندوہناک مظالم ڈھائے کہ تاریخ شرما جائے۔ تب سکھوں کو احساس ہوا کہ اُنھوں نے ہندوؤں کے دھوکے میں آکر اور قائد اعظم کا مشورہ نامان کر تاریخی غلطی کی اور اب ان کی موجودہ نسلیں اس تاریخی غلطی کی قیمت چکا رہی ہیں اور اپنے پرکھوں کے فیصلوں پر ندامت کرتی ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''تاؤ جی یاد کرو محمد علی صاحب جناح جی نے کتنا سمجھایا تھا اس قوم کو۔۔۔ کہ مترو تمھارا دین دھرم، گوردوارہ، ڈیرہ صاحب، گورو جی نانک جی کا ننکانہ، رنجیت سنگھ کی مڑھی اور مقدس مقامات، گوردوارے حتیٰ کہ سارے کہ سارے تقدس کے دھارے اس دھرتی سے پھوٹتے ہیں ۔ جو اب پاکستان میں شامل ہوں گئے۔ لہٰذا ہم سے مل جاؤ۔۔۔ ہمارے ساتھ ملو گے تو پنجاب اک مک رہے گا۔ ننگانہ صاحب سے دربار صاحب تک سارے رشتے ایک لڑی میں پروئے رہیں گے ۔''(۲۰)

دل بہار سنگھ کے اپنے تایا اوتار سنگھ سے بولے یہ الفاظ اسی نقطہ نظر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جب ہندوؤں نے بھارتی حکومت کی سرپرستی میں آپریشن بلیو سٹار کے نام سے باقاعدہ فوجی آپریشن کرتے ہوئے دربار صاحب کا محاصرہ کر لیا گیا اور سکھوں کا وحشیانہ قتل عام کیا گیا تو انھیں احساس ہوا کہ اُنھوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر امرت سر، فیروز پور اور لاہور کے مقامات سے مسلمانوں کو بے

دخل کرنے کے لیے جو خون کی ندیاں بہائی تھیں اور مسلمان خواتین کی آبروریزی کی تھی اور انھیں زندہ در گور ہونے پر مجبور کیا تھا وہ غلط اقدام تھا۔ منشی عبد الرحمٰن نے ان مظالم کے حوالے سے ہندوؤں کی سازش کی بے نقاب کرتے ہوئے ایک کتاب لکھی تھی پاکستان کی قیمت۔ اس کتاب میں شامل ان کا ایک اقتباس اس امر کی نشان دہی کرتا ہے:

> "راج کرے گا خالصہ کے تصور میں سکھ پاگل ہو چکے تھے۔ اور انسانیت کی تمام حدوں کو پار کر چکے تھے۔ انگریز گورنر کی تحریک پر تین دن کے اندر پنجاب کو مسلمانوں سے کالی کروا لیا گیا تھا۔"(۲۱)

اس ناول کے کردار انور خان اور اوتار سنگھ دو بزرگ کردار ہیں جو نا صرف فسادات کے عینی شاہد ہیں بل کہ ان فسادات کے عملی کردار بھی ہیں۔ آپریشن بلیو سٹار کے بعد ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی کا قتل ہوا۔ یہ قتل تین سکھ گارڈز نے کیا۔ ان میں سے مرکزی کردار "ستونت سنگھ" تھا جس پر اندرا گاندھی کو بے حد اعتماد تھا۔ اسی گارڈ کے نام پر اور اسی المناک واقعے کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے یونس جاوید نے اس ناول کا نام ستونت سنگھ کا کالا دن رکھا۔ اس دن پورے ہندوستان میں ہندوؤں نے سکھوں کی عبادت گاہوں، گھروں، املاک اور روزگار کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا اور ہزاروں سکھ قتل ہوئے۔

اس واقعے کے بعد بھات میں خالصتان کی تحریک پوری قوت سے ابھری جو کہ اب بھی کسی بھی وقت ہندوستان میں چنگاری سلگا سکتی ہے کیوں کہ طاقت کے زور پر مستقل طور پر کسی بھی تحریک کو ہمیشہ کے لیے دبایا نہیں جا سکتا۔ انور خان اور اوتار سنگھ کی کم و بیش سات دہائیوں بعد دونوں ممالک کی صورت حال بارے گفت گو کے ذریعے یونس جاوید اور پاکستان کو در پیش عصر حاضر کے بڑے بڑے چیلنجز کی نشان دہی کی ہے:

> "اوے تم لوگوں نے پاکستانی کا پانی توڑنا شروع کر دیا ہے۔ دے ڈیم پہ ڈیم۔ ڈے بند پہ بند آخر تمہارے وڈے چاہتے کیا ہیں۔"(۲۲)

پاکستان اور بھارت کے درمیان سندھ طاس سمیت پانی کی تقسیم کے جتنے معاہدے بھارت نے سب معاہدوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان دریاؤں کی اپنی حدود میں ڈھیروں ڈیم بنا کر پاکستان کی زراعت کو بے حد نقصان پہنچایا ہے اور اب پانی کو بطور جنگی ہتھیار استعمال کرتے ہوئے سیلاب کے موسموں میں کثیر مقدار میں اچانک پانی چھوڑ کر خوف ناک تباہی پھیلا رہا ہے۔ اس ناول میں اوتار سنگھ اور انور خان کو قانون نافذ کرنے والے ادارے گرفتار کر کے لے جاتے ہیں اور دہشت گرد قرار دے کر پابند سلاسل کر دیتے ہیں۔ جیل کی بند کھڑکیوں میں لائے جانے والے افراد کے بیانات سے یونس جاوید نے پاکستان میں امن و امان کی حالیہ صورت حال، امن کے ذمہ دار اداروں کے کردار اور ملزموں سے تفتیش کے ناقص نظام کی نشان دہی کرتے ہوئے اس بات کی ضرورت پر زور دیا ہے کہ اگر معاشرہ اسی ڈگر پر چلتا رہا تو پاکستانی قوم کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ یہ ناول موجودہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی گراوٹ کے خلاف سماجی بیداری کے لیے ایک تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔

یونس جاوید نے اپنے ناولوں میں سماجی زندگی کے حقایق کو مکمل غیر جانب داری اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر پیش کیا ہے اور سماجی اصلاح کی اپنی ذمہ داری نبھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ میجر پانڈے، ادب کی سماجیات (تعبیر و روایت)، (مترجم)، سرور الہدیٰ، ڈاکٹر، نئی دہلی، انجمن ترقی اُردو ہند، ۲۰۰۶ء، ص:۵۳

۲۔ محمد حسن، ڈاکٹر، ادبی تنقید، لکھنو، ادارہ فروغ اُردو، ۱۹۵۴ء، ص:۸

۳۔ علی عباس حسینی، اُردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۷ء، ص:۳۴۷

۴۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، (مشمولہ)، مباحث، لاہور، مجلس ترقی اُردو ادب، 1965ء، ص:۲۷۹

۵۔ انٹرویو، سید عامر سہیل، (مشمولہ)، انگارے، ملتان، عاتکہ پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۵ء، ص:۱۷

۶۔ یونس جاوید، آخر شب، لاہور، ادارہ نو، ۱۹۶۲ء، ص:۶۲

۷۔ ایضاً، ص:۶۳

۸۔ ایضاً، ص:۱۱۰

۹۔ ایضاً، ص:۱۸۶

۱۰۔ شادی کے نام پر سودا: WWW.BBC.COM، ۳۱۔ جنوری ۲۰۱۷ء

۱۱۔ شاہد الرحمٰن، ڈاکٹر، ہم عصر اُردو فکشن میں حاشیائی کرداروں کی عکاسی، بزم صدف انٹرنیشنل، ۲۰۱۷ء، ص:۱۲۹

۱۲۔ یونس جاوید، کنجری کا پل، لاہور، جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص:۵۱

۱۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستانی شاعرات تخلیقی خدوخال، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص:۳۱

۱۴۔ یونس جاوید، کنجری کا پل، ص:۳۰تا۳۱

۱۵۔ ایضاً، ص:۳۱

۱۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، کنجری کا پل اور یونس جاوید، (مشمولہ)، چہار سو، ص:۴۷

۱۷۔ یونس جاوید، کنجری کا پل، ص:۵۵

۱۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، کنجری کا پل اور یونس جاوید، (مشمولہ) چہار سو، ص:۴۸

۱۹۔ علی سردار جعفری، اَدب اور سیاست کا رشتہ، مشمولہ: ادب، زندگی اور سیاست، (مرتبہ)، خاور نوازش، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۲ء، ص:۳۲۳

۲۰۔ یونس جاوید، ستونت سنگھ کا کالا دن، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص:۳۱

۲۱۔ منشی عبد الرحمٰن، پاکستان کی قیمت، ملتان، جاوید اکیڈمی، ۱۹۸۳ء، ص:۲۰

۲۲۔ یونس جاوید، ستونت سنگھ کا کالا دن، ص:۱۴۰

Reference in Roman Script:

1. Major Panday, Adab Ki Samajiat (Tabeer o Riwayat), Mutrajim: Suroor Alhdi, Dr, Nai Dehli, Anjuman Taraqqi Urdu Hind, 2006, P.53
2. Mohammad Hussan, Dr, Adbi Tanqeed, Lakhnow, Idaara Farogh Urdu,1954, P.8
3. Ali Abbas Hussaini, Urdu Novel Ki Tareekh Aur Tanqeed, Ali garh, Educational Book House, 1987, P.347
4. Syed Abdullah, Dr, Urdu Adab Ki Thrikin, Masmolah: Mubahis, Lahore,Majlis Taraqqi Urdu Adab,1965, P.279
5. Interview, Syed Aamir Sohail,(Mashmolah),Angare,Multan,Aatika Printing Press,Augst 2005, P.17
6. Younis Javed, Aakhir Shab, Lahore,Idaara Nau 1962, P.62
7. Ibid, P.63
8. Ibid, P.110
9. Ibid, P.186
10. Shadi Ke Naam Par Soda: www. bbc. com, 31 January 2017
11. Shahid al-Rehman, Dr, Hum Asar Urdu Fiction Mein Hashiyaie Krdaron K Akkaasi, Bazm Sadaf International,2017, P.129
12. Younis Javed, Kanjri ka Pul,Lahore, Jamhoori Pablications,2011, P.51
13. Saleem Akhtar, Dr, Pakistani Shaarat Takhleeqi Khadd-o-Khaal,Lahore,Sang-e-Meel Pablications,2008, P.31
14. Younis Javed, Kanjari ka Pul, P.30 to 31
15. Ibid, P.31
16. Saleem Akhtar, Dr, Kanjari Ka Pal Aur Yunis Javed,(Mashmolah),Chaar So, P.47
17. Younis Javed, Kanjari Ka Pual, P.55
18. Chahar So, P 48
19. Ali Sardar Jafferi, Adab Aur Siyasat Ka Rishta, Mashmola: Adab, Zindagi Aur Siyasat, Martaba: Khawar Nawazish, Faisalabad, Misaal Publishers, 2012, P.323
20. Younis Javed, Stunat Singh Ka Kala Din,Lahore, Sang-e-Meel Pablication, Lahore, 2014, P.31
21. Munshi Abdul Rahman, Pakistan ki Qeemat, Multan, Javed Academy, 1983, S.20
22. Younis Javed, Stunat Singh Ka Kala Din,Lahore, Sang-e-Meel Pablication, Lahore, 2014, P 140